شریعت، طریقت اور اجتماعیت پر مبنی دینی شعور کا نقیب

ماہنامہ

رحیمیہ

لاہور

اکتوبر 2026ء / جمادی الاولیٰ ۱۴۴۸ھ

جلد نمبر 18، شمارہ نمبر 10 قیمت : 40 روپے ● سالانہ ممبر شپ : 450 روپے

بانی

حضرت اقدس مولانا **شاہ سعید احمد** رائے پوری

قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ السَّعِیْد مسند نشین رابع خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

مدیرِ اعلیٰ

حضرت اقدس مولانا مفتی **عبدالخالق آزاد** رائے پوری

جانشین حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن	(سرپرست)
مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی	(صدر)
مولانا مفتی محمد مختار حسن	(صدر انتظامیہ)
انیس احمد سجاد ایڈووکیٹ	(مدیر)

ترتیبِ مضامین

- مسلمانوں کو حرام کھانوں سے بچنا لازمی ہے
- مزاحمتی نظریہ اپنانے کی ضرورت
- حضرت عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ
- نئے صوبے یا ریاست کی تشکیلِ نو؛ سامراجی وِرثے سے قومی خودشناسی تک
- معاشی وسائل پر مبنی رزق کے حصول سے متعلق ابواب
- رسالتِ محمدی ﷺ کی عالمگیریت اور انسانیت کی کامیابی
- رسالتِ نبوی ﷺ: قوتِ نافذہ اور نظامِ حکومت
- دینِ اسلام کا نظامِ عبادات، اجتماعیت اور نظم وضبط
- دین و دنیا کی جامعیت اور رسالتِ نبوی ﷺ کی سیاسی اتھارٹی
- عثمانی سلطنت کے دسویں حکمران؛ سلیمان اعظم
- حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
- دینی مسائل
- ''رحیمیہ مطبوعات لاہور'' کی جانب سے نئی پیش کش: ''ایمان کی چھاؤں میں''

ارشادِ گرامی

حضرت اقدس مولانا **شاہ عبدالقادر** رائے پوری قدس سرہ مسند نشینِ ثانی خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

دعوتِ اسلام کی راہ میں حائل رُکاوٹیں دور کرنے کے لیے حکومت قائم کی جاتی ہے

حضرت والاؒ نے (مولوی گلزار احمد مظاہری صاحب سے جو جماعت اسلامی کے رکن اور اس کی ذیلی تنظیم جمعیت اتحاد العلماء کے صدر تھے) فرمایا کہ: ''انبیا علیہم السلام اور خود حضور ﷺ نے اسلام کی تبلیغ بلا اکراہ (یعنی: کسی پر جبر کیے بغیر) شروع کی، مگر مخالفین نے اپنی (تمام تر) ذاتی، جماعتی اور سیاسی قوتوں کو (عوام الناس تک اسلام کی) تبلیغ کے روکنے کے لیے صَرف کیا۔ جس کا نتیجہ تصادم کے بعد اسلام کی حکومت (کے قیام) کی شکل میں نمودار ہوا، ورنہ اسلام کا مقصد (غلبہ دین کے نظریے کے بغیر) اپنی حکومت (برائے حکومت) قائم کرنا نہ تھا (بلکہ واقعہ یہ ہے کہ) تبلیغ کی مقبولیت کی (راہ میں حائل ملکی نظام کی) رُکاوٹ کو دور کرنے کے لیے حکومت قائم کرنی پڑی''۔

(۲۰/محرم الحرام ۱۳۶۶ھ/ 13/دسمبر 1946ء، بروز: جمعہ۔ مقام: ڈھڈیاں)

(ارشادات حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، ص: 252، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ ٹرسٹ لاہور

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

0092-42-36307714,36369089-www.rahimia.org

Email: info@rahimia.org

تفسیر: شیخ التفسیر مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

مسلمانوں کو حرام کھانوں سے بچنا لازمی ہے

گزشتہ آیات (2-البقرہ: 168 تا 171) میں انسانوں کو خطاب کر کے انسانی اجتماعیت میں کھانے پینے سے متعلق بنیادی الٰہی اُصول اور احکامات واضح کیے گئے تھے اور رزقِ حلال اور پاکیزہ وطیب رزق کھانے کا حکم دیا گیا تھا۔ انسانیت کی بقا کے لیے کھانے پینے میں احتیاط رکھنا ضروری ہے۔ یہ انسانی اجتماعیت کا لازمی تقاضا ہے۔ اس لیے اللہ کے احکامات کو نظرانداز کر کے شیطان یا بے عقل آباؤاجداد کی پیروی کرنا بالکل درست نہیں ہے۔

ان آیات (2-البقرہ: 172-173) میں انسانوں میں سے اللہ پر ایمان لانے والے مسلمانوں کو خطاب کر کے اُس کے دیے ہوئے پاکیزہ رزق کو استعمال کرنا اور معاشی وسائل کی فراہمی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز ملتِ ابراھیمیہ حنیفیہ میں کھانے پینے کی چیزوں میں لازمی حرام اشیا کی ایک فہرست جاری کی گئی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو): گزشتہ آیت (168) میں انسانوں کو مخاطب کر کے زمین سے پیدا ہونے والی حلال اور طیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس آیت (172) میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والی جماعت کو خطاب کیا جا رہا ہے کہ انھیں نہ صرف انسانی تقاضے سے حلال اور پاکیزہ رزق استعمال کرنا ہے، بلکہ اُن کا ایمانی تقاضا بھی ہے کہ اللہ نے جو معاشی وسائل زمین میں رکھے ہیں، اُن میں سے صرف پاکیزہ چیزوں کا انتخاب کریں، اور خاص طور پر کھانے پینے میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ جسم انسانی کی ساخت انھی پاکیزہ چیزوں کے ذریعے سے بنتی ہے، تو اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کا ایمانی تقاضا بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا ہے۔

وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کے بندے ہو): ایمان والوں کو ایک حکم تو یہ دیا گیا کہ وہ پاکیزہ رزق کھائیں اور اپنی ضروریات کے لیے استعمال میں لائیں۔ دوسرا حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ معاشی وسائل پر مشتمل ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔ یعنی: ان چیزوں کو اسراف وتبذیر میں ضائع کرنے کے بجائے ان کا صحیح، درست اور برموقع استعمال کریں اور اللہ تعالیٰ کے معاشی انعامات حاصل ہونے پر اُس کا دل سے شکریہ ادا کیا جائے۔ خاص طور پر تم جب صرف اُسی اللہ تبارک وتعالیٰ کے بندے ہو اور اُسی پر ایمان لانے کا دعویٰ رکھتے ہو تو پاکیزہ رزق کا استعمال اور شکرِ خداوندی ادا کرنا تمھارے لیے انتہائی لازمی اور ضروری ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ (اس نے تو تم پر یہی حرام کیا ہے مردہ جانور، اور لہو، اور گوشت سور کا، اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اَور کا): اس آیتِ مبارکہ میں ملتِ ابراھیمیہ حنیفیہ کے تحت شریعتِ محمدی میں حرام کی گئی اشیا کی ایک فہرست جاری کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے درجِ ذیل چار چیزوں کو تم پر حرام قرار دیا ہے:

1۔ اَلْمَیْتَةَ (مردہ جانور): شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”مردار وہ ہے کہ خود بہ خود مرجائے اور ذبح کی نوبت نہ آئے، یا خلافِ طریقۂ شرعیہ اس کو ذبح یا شکار کیا جائے، مثلاً: گلا گھونٹا جائے، یا زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے، یا لکڑی اور پتھر اور غلیل و بندوق سے مارا جائے، یا اوپر سے گر کر یا کسی جانور کے سینگ مارنے سے مرجائے، یا درندہ پھاڑ ڈالے، یا ذبح کے وقت قصداً تکبیر کو ترک کیا جائے، کہ یہ سب مُردار اور حرام ہیں، البتہ دو جانور مُردار بہ حکمِ حدیث شریف اس حرمت سے مستثنیٰ اور ہم کو حلال ہیں: مچھلی اور ٹڈی“۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمھارے لیے دو مُردار اور دو خون حلال کر دیے گئے ہیں: رہے دونوں مردار تو وہ مچھلی اور ٹڈی ہے، اور رہے دونوں خون: تو وہ جگر (کلیجی) اور تلی ہے“۔ (سنن ابن ماجہ، كتاب الأطعمة، حديث: 3314)

2۔ وَ الدَّمَ (اور لہو): حضرت شیخ الہندؒ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ”اور خون سے مراد وہ خون ہے، جو رگوں سے بہتا ہے، اور ذبح کے وقت نکلتا ہے، اور جو خون کہ گوشت پر لگا رہتا ہے وہ حلال اور پاک ہے۔ اگر گوشت کو بغیر دھوئے ہوئے پکا لیا جائے تو اس کا کھانا درست ہے۔ البتہ نظافت کے خلاف ہے اور کلیجی اور تلی کہ خون منجمد ہیں، بحکم حدیث شریف حلال ہیں“۔ (بحوالہ حدیث بالا)

3۔ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ (اور سور کا گوشت): حضرت شیخ الہندؒ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ”اور خنزیر زندہ ہو یا مردہ، یا قاعدۂ شریعت کے موافق ذبح کرلیا جائے، ہر حال میں حرام ہے، اور اس کے تمام اجزا؛ گوشت، پوست، چربی، ناخن، بال، ہڈی، پٹھا؛ ناپاک اور ان سے نفع اُٹھانا اور کسی کام میں لانا حرام ہے۔

اس موقع پر چوں کہ کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے، اس لیے فقط گوشت کا حکم بتلایا گیا، مگر اس پر سب (فقہا) کا اجماع ہے کہ خنزیر جو کہ بے غیرتی اور بے حیائی اور حرص اور رغبت الی النجاسات (گندگیوں کی طرف رغبت) میں سب جانوروں میں بڑھا ہوا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت ”فَاِنَّهٗ رِجْسٌ“ (بے شک وہ گندگی ہے) (6-الانعام: 145) فرمایا: بلاشک نجس العین (اس کی ہر چیز ناپاک) ہے، نہ اس کا کوئی جزو پاک اور نہ کسی قسم کا انتفاع (نفع اُٹھانا) اس سے جائز۔ جو لوگ کثرت سے اس کو کھاتے ہیں اور اس کے اجزا سے نفع اٹھاتے ہیں، اُن تک میں (گندے) اوصافِ مذکورہ واضح طور پر مشاہدہ ہوتے ہیں“۔

4۔ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ (اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اَور کا): حضرت شیخ الہندؒ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ کا یہ مطلب ہے کہ ان جانوروں پر اللہ کے سوا بت وغیرہ کا نام پکارا جائے، یعنی: اللہ کے سوا کسی بت، یا جن، یا کسی روحِ خبیث، یا پیر، یا پیغمبر کے نامزد کر کے، اور اس جانور کی جان

ان کی نذر کر کے، ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے۔ اور محض ان کی خوشنودی کی غرض سے اس کی جان نکالنی مقصود ہو۔ ان سب جانوروں کا کھانا حرام ہے۔ گو (اگرچہ) بہ وقتِ ذبح تکبیر پڑھی ہو اور اللہ کا نام لیا ہو، کیوں کہ جان کو جانِ آفرین (ذاتِ باری تعالیٰ) کے سوا کسی دوسرے کے لیے نذر و نیاز کرنا' ہرگز درست نہیں۔

اس لیے جس جانور کی جان' غیر اللہ کی نذر کی جائے تو اس کی خباثت مردار کی خباثت سے بھی بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ ''مردار'' میں تو یہی خرابی تھی کہ اُس (مُردار) کی جان اللہ کے نام پر نہیں نکلی، اور اِس کی تو جان غیر اللہ کے نامزد کر دی گئی، جو عین شرک ہے۔ سو! جیسے خنزیر اور کتے پر بہ وقتِ ذبح تکبیر کہنے سے حلت نہیں آسکتی اور مردار پر اللہ کا نام لینے سے کوئی نفع نہیں ہوسکتا، ایسے ہی جس جانور کی جان' غیر اللہ کی نذر اور ان کے نامزد (نام پر) کر دی ہو، اس پر ذبح کے وقت نامِ الٰہی لینے سے ہرگز ہرگز کوئی نفع اور حِلّت اس میں نہیں آسکتی، البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد اپنی نیت سے ہی توبہ اور رجوع کر کے ذبح کرے گا تو اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

علما نے تصریح فرما دی ہے کہ: اگر کسی بادشاہ کے آنے پر اس کی تعظیم کی نیت سے جانور ذبح کیا جائے، یا کسی جن کی اذیت سے بچنے کے لیے اس کے نام کا جانور ذبح کیا جائے، یا توپ چلنے یا اینٹوں کے پزاوہ (بھٹے) کے پکنے کے لیے بہ طورِ بھینٹ جانور ذبح کیا جائے، تو وہ جانور بالکل مردار اور حرام، اور کرنے والا مشرک ہے۔ اگرچہ ذبح کے وقت خدا کا نام لیا جائے۔

حدیث شریف میں آیا ہے: ''لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ ذَبَحَ لِغَیْرِ اللّٰہ'' (صحیح مسلم، حدیث: 5126) یعنی: ''جو غیرُ اللّٰہ کے تقرُّب اور تعظیم کی نیت سے جانور کو ذبح کرے، اس پر اللہ کی لعنت ہے''۔ ذبح کے وقت اللہ کا نامِ پاک لے یا نہ لے۔ البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کر کے فقرا کو کھلائے اور اس کا ثواب کسی قریب یا پیر اور بزرگ کو پہنچا دے، یا کسی مردہ کی طرف سے قربانی کر کے اس کا ثواب اس کو دینا چاہے، کیوں کہ یہ ذبح غیر اللہ کے لیے ہرگز نہیں۔

بعضے (بعض لوگ) اپنی کج روی سے یہ حیلہ ایسے مواقع میں بیان کرتے ہیں کہ پیروں کی نیاز وغیرہ میں ہم کو تو یہی مقصود ہوتا ہے کہ کھانا پکا کر مردہ کے نام سے صدقہ کر دیا جائے، تو اوّل تو خوب سمجھ لیں کہ اللہ کے سامنے جھوٹے حیلوں سے بجز مضرت (نقصان) کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا، دوسرے ان سے پوچھا جائے کہ جس جانور کی تم نے غیرِ خدا کے لیے نذر مانی ہے، اگر اسی قدر گوشت اس جانور کے عوض خرید کر اور پکا کر فقیروں کو کھلا دو تو تمھارے نزدیک بے کھٹکے (بغیر شک کے) وہ نذر ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر بلا تامل تم اس کو کر سکتے ہو اور اپنی نذر میں کسی قسم کا خلل تمھارے دل میں نہیں رہتا تو تم سچے، ورنہ تم جھوٹے، اور تمھارا یہ فعل شرک، اور وہ جانور مردار اور حرام''۔

حضرت شیخ الہندؒ اس آیت پر ایک فائدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فائدہ: یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ آیت میں حکمِ حرمت کو اشیائے مذکورہ میں منحصر کر کے بیان فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اشیائے مذکورہ کے سوا کوئی جانور حرام نہیں، حال آں کہ جملہ درندے اور گدھا اور کُتا وغیرہ سب کا کھانا حرام ہے۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ: اس حصر (إِنَّمَا) سے حکمِ حرمت کو اشیائے مذکورہ میں منحصر کرنا ہرگز مراد نہیں کہ کسی کو اعتراض کی گنجائش ہو، بلکہ حکمِ حرمت کو صحت و صداقت کے ساتھ مخصوص فرما کر اس حکم کی جانبِ مخالف کا بُطلان منظور ہے۔ یعنی: بس بات یہی ہے کہ یہ چیزیں اللہ پاک نے تم پر حرام فرما دیں۔ اس میں دوسرا احتمال ہی نہیں، یعنی: ان (چیزوں) کا حلال سمجھنا' بالکل باطل اور غلط ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ: حکمِ حرمت کو اشیائے مذکورہ ہی میں منحصر مانا جائے، مگر اس حصر کو اضافی — یعنی: خاص انھی چیزوں کے لحاظ سے — تسلیم کیا جائے جن کو مشرکین نے اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا، جیسے ''بحیرہ'' اور ''سائبہ'' وغیرہ — جن کا ذکر آئندہ (5-المائدہ: 103 میں) آئے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تو تم پر فقط ''میتۃ'' اور ''خنزیر'' وغیرہ کو حرام کیا تھا، تم جو سانڈ وغیرہ کی تحریم اور تعظیم کے قائل ہو، یہ محض تمھارا افترا ہے۔ باقی رہے درندے اور خبیث جانور، ان کے حرام ہونے میں مشرکین بھی نزاع (جھگڑا) نہ کرتے تھے۔ سو! یہ حصر انھی جانوروں کے لحاظ سے ہے، جن کو مشرکین نے خلافِ حکمِ الٰہی اپنی طرف سے حرام ٹھہرا لیا تھا۔ تمام جہان کے جانوروں سے اس کو کیا تعلق، جو اعتراضِ مذکور کی نوبت آئے''۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(پھر جو کوئی بے اختیار ہو جائے، نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی، تو اس پر کچھ گناہ نہیں، بے شک اللہ ہے بڑا بخشنے والا نہایت مہربان): حضرت شیخ الہندؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''یعنی: اشیائے مذکورہ حرام ہیں، لیکن جب کوئی بھوک سے مرنے لگے تو اس کو لاچاری کی حالت میں کھا لینے کی اجازت ہے، بشرطیکہ نافرمانی اور زیادتی نہ کرے، نافرمانی: یہ کہ مثلاً نوبت اضطرار کی نہ پہنچے اور کھانے لگے، اور زیادتی: یہ کہ قدرِ ضرورت سے زائد خوب پیٹ بھر کر کھالے، بس اتنا ہی کھائے جس سے مرے نہیں۔ یعنی: اللہ پاک تو بڑا بخشنے والا ہے، بندوں کے ہر قسم کے گناہوں کو بخش دیتا ہے، پھر ایسے لاچار اور مضطر کی بخشش کیسے نہ فرمائے گا! اور اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے کہ مجبوری کی حالت میں صاف اجازت دے دی کہ جس طرح بن پڑے اپنی جان بچالو! اصلی حکم ممانعت کا لاچاری کی حالت میں تم پر سے اٹھا لیا گیا، ورنہ اس مالک الملک کا حق تھا کہ فرما دیتا تمھاری جان جائے یا رہے، مگر ہمارے حکم کے خلاف ہرگز نہ کرنا۔

ایک خلجان یہاں یہ بھی ہوتا تھا کہ بھوک سے مرتے ہوئے مضطر بدحواس کو یہ اندازہ کرنا کہ اتنے لقموں سے سدِ رَمق ہو جائے گا اور اس سے زائد ایک لقمہ نہ کھائے، محال نہیں تو دشوار تو بہت ہے، اس لیے اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ فرما کر اس میں سہولت کر دی''۔

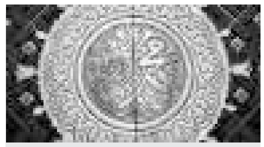

درسِ حدیث

از: مولانا ڈاکٹر محمد ناصر، جھنگ

مزاحمتی نظریہ اپنانے کی ضرورت

عَنْ أَبِی سَعِیدِ نِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ’’یُوشِکُ أَنْ یَکُونَ خَیْرَ مَالِ الرَّجُلِ غَنَمٌ، یَتْبَعُ بِھَا شَعَفَ الْجِبَالِ، وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ، یَفِرُّ بِدِینِہٖ مِنَ الْفِتَنِ‘‘. (الجامع الصحیح للبخاری، 3300)

(حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہٗ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’ایک زمانہ آئے گا جب مسلمان کا سب سے عمدہ مال اس کی وہ بکریاں ہوں گی، جنھیں وہ پہاڑ کی چوٹیوں اور بارش کی وادیوں میں لے کر چلا جائے گا، تاکہ اس طرح اپنے دین وایمان کو فتنوں سے بچالے‘‘۔)

اس مضمون کی بعض احادیث کو بنیاد بنا کر اجتماعی ذمہ داری سے پہلوتہی کا راستہ تلاش کیا جاتا ہے، جب کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی وقت دین پر عمل کرنا مشکل ہوجائے تو آپ اس نظام سے علاحدگی اختیار کرلیں۔ اس نظام کے ساتھ آپ کا برتاؤ ایسا نہیں ہونا چاہیے جو اس سسٹم کو تقویت دے۔ بکری کی مثال اس لیے دی گئی ہے کہ بکری کی بڑھوتری بہت ہوتی ہے، یہ آسانی سے پلتی ہے۔ گویا جب سوسائٹی ایسی پستی کا شکار ہوجائے کہ اس میں آپ کا دین خطرے میں پڑ جائے تو اس نظام کی حمایت سے لاتعلق ہوکر ایسا راستہ اپنائیں، جس میں آپ کا دین بچ جائے اور دین کی جدوجہد تیزی کے ساتھ بڑھے، جیسے بکری کا معاملہ ہے، اسی طرح تمھاری کوشش ترقی پذیر ہونی چاہیے نہ کہ زوال پذیر۔ گویا فاسد ماحول میں جذب ہوکر اپنے وجود کو خطرے میں ڈالنے کے برعکس اس نظام سے علاحدگی اختیار کر کے آپ اس نظام کو بدلنے کی حکمت عملی میں مصروف ہوجائیں۔ اس حدیث کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ ایسی صورت میں آپ سماجی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوجائیں اور اس نظام کی تبدیلی کی جدوجہد چھوڑ دیں۔

ذخیرہ احادیث میں ایسی متعدد روایات ہیں جو ایسے فاسد ماحول کو تبدیل کرنے کے عمل کو اولوالعزم لوگوں کا شیوہ قرار دیتی ہیں۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اسلام کی دعوت دینے والے اجنبی لوگ تصور کیے جائیں گے، (صحیح مسلم: 145) اجنبی وہ قرار پائیں گے جو اجتماعیت کی بات کرتے ہیں۔ سطح بیں لوگ کہیں گے کہ اجتماعیت کے داعی کیسی نامانوس بات کرتے ہیں، یہ کیسے دینی نظام کے غلبے اور موجودہ اکثریت کی سوچ سے علاحدگی کی بات کرتے ہیں؟ ایسے اجنبی لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری دی، یعنی یہی لوگ دین کا غلبہ قائم کرنے کے راستے پر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جابر سلطان کے سامنے سچی بات کہنے کو افضل الجہاد کہا ہے، (الترمذی: 2174) یعنی غلط مؤقف کے خلاف آپ سینہ سپر ہوجائیں۔ حاصل یہ کہ مذکورہ حدیث سماجی ذمہ داریوں سے فرار کی راہ اختیار کرنے کے برعکس یہ حکمت عملی بتاتی ہے کہ ایسے وقت پر آپ اس نظام سے علاحدہ ہوکر دین پر عمل کرنے کا ماحول بنانے کی کوشش کرتے رہیں۔

صحابہؓ کا ایمان افروز کردار

مولانا قاضی محمد یوسف، حسن ابدال

حضرت عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہٗ

حضرت عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہٗ قدیم الاسلام، سابقون الاولون، مہاجرینِ حبشہ و مدینہ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپؓ اسلام کے ایک جاں باز سپاہی تھے۔ آپؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک صحابہ میں ایک نمایاں مرتبہ اور مقام رکھتے تھے۔ صحابہؓ میں صف اول کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور نبی پاکؐ کے لیے جو صحابہ کرامؓ قوتِ بازو اور مشیرانِ خاص کی حیثیت رکھتے تھے، ان میں سرفہرست حضرت عبداللہؓ کا نام بھی تھا۔

حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے اپنی والدہ، تینوں بھائیوں اور بہنوں سمیت اسلام قبول کیا۔ آپؓ کی والدہ اُمیمہ بنت عبدالمطلب' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی تھیں۔ آپؓ کی بہن سیّدہ زینب بنت جحشؓ کا نکاح اللہ تعالیٰ نے خود اپنے حکم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تجویز فرمایا۔ اس طرح حضرت عبداللہؓ، رسول اللہؐ کے قریب ترین نسبی متعلقین میں سے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بدر میں عظیم الشان تاریخ ساز کامیابی سے ہم کنار کیا، مشرکین میں سے بڑے بڑے 70 سردار قتل ہوگئے اور نامور طاقتور 70 سردار گرفتار ہوکر مدینہ پہنچ گئے تو آپؐ نے ان قیدیوں کے بارے میں جن تین صحابہ سے مشورہ کیا، ان میں حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ اور عبداللہ بن جحشؓ شامل ہیں۔ یہ تینوں پاک باز بزرگ آپؐ کے وزیر تھے۔ اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ: ’’اسلام میں سب سے پہلا امیر جس کو نبی کریمؐ نے منتخب فرمایا تھا، وہ عبداللہ بن جحشؓ تھے‘‘۔ نبی کریمؐ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: ’’میں تمھارے لیے ایسے شخص کو امیر منتخب کرتا ہوں، جو تم میں سب سے زیادہ بھوک اور پیاس پر صبر کرسکتا ہے‘‘۔ یہ فرما کر آپؐ نے عبداللہ بن جحشؓ کو رجب سن ۲ ہجری میں ’’سریۂ نخلہ‘‘ کا امیر منتخب فرمایا۔ اسی طرح اسلام میں سب سے پہلا جھنڈا عبداللہ بن جحشؓ کے ہاتھ سے لہرایا گیا تھا۔ اسلام میں سب سے پہلا مال غنیمت آپؓ کے ہاتھ سے حاصل ہوا۔ اسلام میں سب سے پہلے کفار کو گرفتار کرنے والا عبداللہ بن جحشؓ کا سریہ ہے۔

غزوۂ احد میں کفار کے پلٹ کر حملہ کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑ کے آنے والے لوگوں میں سے ایک نام عبداللہ بن جحشؓ کا بھی ہے اور اسی وقت آپؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ نبی پاکؐ کے خاندان میں سے حضرت حمزہؓ، حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور جلیل القدر نوجوان صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم ان تینوں کی شہادت سے جو صدمہ پہنچا تھا، اتنا بڑا صدمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی میں کبھی نہیں پہنچا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ اس طرح حضرت عبداللہؓ کی زندگی شروع اسلام سے موت تک اسلام کی قوت، غلبے اور شوکت کے لیے قربانیوں کا ایک شان دار مرقع ہے۔ آپؓ نے اپنی ہر صلاحیت دین حق کے استحکام اور اس کے دشمنوں کے ہر منصوبے کو ناکام بنانے میں خرچ کرڈالی اور رہتی دنیا تک یادگار اسوہ حق چھوڑ گئے۔

نئے صوبے یا ریاست کی تشکیلِ نو

سامراجی وِرثے سے قومی خودشناسی تک

پاکستان میں نئے صوبوں کے قیام کا سوال بہ ظاہر انتظامی تقسیم کا مسئلہ دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کے پسِ منظر میں ریاستی نظم و نسق، حکمرانی کے طریقِ کار، مرکز اور صوبوں کے تعلقات، اختیارات کی تقسیم، عوامی شرکت، علاقائی شناخت اور شہریوں کے ریاست سے تعلق جیسے بنیادی سوالات موجود ہیں۔ اس لیے نئے صوبوں کے مطالبے کو محض نقشے پر نئی لکیریں کھینچنے کا مسئلہ سمجھنا' اس کے وسیع تر تاریخی اور سیاسی پس منظر کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہوگا۔ پاکستان کی انتظامی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ریاست نے کئی مرتبہ اپنے انتظامی ڈھانچے کو تبدیل کیا، لیکن انتظامی نقشے میں تبدیلی کے باوجود حکمرانی کے بنیادی مسائل پوری طرح حل نہیں ہو سکے۔

قیامِ پاکستان سے قبل برصغیر میں انتظامی تقسیم موجودہ قومی ریاست کے تصور سے مختلف تھی۔ برطانوی ہندوستان کے زیرِ انتظام علاقوں کے ساتھ متعدد ریاستیں اور نیم خودمختار علاقے بھی موجود تھے۔ بلوچستان بھی ایک متحدہ انتظامی اکائی کی صورت میں موجود نہیں تھا۔ برطانوی بلوچستان کے علاوہ ریاست قلات اور اس سے وابستہ علاقوں کے ساتھ مکران، خاران اور لسبیلہ جیسی ریاستیں اپنے مخصوص سیاسی اور انتظامی تشخص رکھتی تھیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان علاقوں کے پاکستان کے ساتھ تعلق اور انضمام نے بلوچستان کی آئندہ انتظامی تشکیل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

1947ء اور 1948ء کے دوران مختلف ریاستوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق اور بعد ازاں ان کے انتظامی انضمام کا عمل جاری رہا۔ اس دور میں ریاستی نظم کو مستحکم کرنے کے لیے مختلف انتظامی تجربات کیے گئے۔ بلوچستان میں ریاستوں کے اتحاد کا ایک انتظامی تجربہ بھی سامنے آیا، جس کے بعد 1955ء میں وَن یونٹ کے قیام نے پورے مغربی پاکستان کے انتظامی ڈھانچے کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا۔ اس اقدام کے تحت پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں کو ایک بڑی انتظامی اکائی میں ضم کیا گیا۔ اس تبدیلی کا بنیادی مقصد؛ انتظامی وحدت اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سیاسی توازن پیدا کرنا تھا، لیکن اس کے نتیجے میں علاقائی شناختوں اور صوبائی خوداختیاری کے مسائل مزید نمایاں ہوئے۔

1956ء میں پاکستان کا پہلا آئین نافذ ہوا اور ملک کو ایک وفاقی جمہوریہ قرار دیا گیا، لیکن وَن یونٹ کی وجہ سے مغربی پاکستان میں صوبائی شناختیں اپنی سابقہ حیثیت میں موجود نہیں تھیں۔ 1958ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد سیاسی اور انتظامی مرکزیت کا رُجحان مزید مضبوط ہوا۔ اس کے بعد بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف ہوا اور 1962ء میں نیا آئین نافذ کیا گیا، جس میں صدارتی نظام قائم کیا گیا۔ اس پورے دور میں ریاستی نظم کا مرکز سے نچلی سطح تک تعلق بنیادی طور پر انتظامی کنٹرول کے زاویے سے تشکیل پاتا رہا، جب کہ عوامی شرکت اور حقیقی سیاسی اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ پوری طرح حل نہ ہو سکا، بلکہ مزید شدت اختیار کر گیا۔

1970ء پاکستان کی انتظامی اور سیاسی تاریخ میں ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ وَن یونٹ ختم ہوا اور مغربی پاکستان کی صوبائی شناختیں دوبارہ بحال یا قائم ہوئیں۔ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اپنی الگ صوبائی حیثیت میں سامنے آئے۔ اسی سال عام انتخابات ہوئے، لیکن سیاسی اختلافات اور اقتدار کی منتقلی کے بحران نے بالآخر 1971ء کے سانحے کو جنم دیا۔ مشرقی پاکستان کی علاحدگی نے یہ حقیقت نمایاں کر دی کہ محض انتظامی وحدت یا مرکزیت' ریاستی اتحاد کی ضمانت نہیں ہوتی، قومی وحدت کے لیے سیاسی نمائندگی، صوبائی خوداختیاری، عوامی شرکت اور ریاستی اداروں پر اعتماد بھی ضروری ہے۔

1973ء کے آئین نے پاکستان کے لیے وفاقی پارلیمانی نظام کی بنیاد فراہم کی۔ وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم، صوبائی اسمبلیوں کے قیام اور مشترکہ مفادات کے ادارہ جاتی تصور نے اس بات کو تسلیم کیا کہ پاکستان جیسے متنوع ملک میں ریاستی استحکام کے لیے وفاقی توازن ضروری ہے۔ بعد کے آئینی ارتقا میں بھی وفاقی اور صوبائی تعلقات مسلسل زیرِ بحث رہے اور وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ پاکستانی سیاسی مباحث کا مستقل حصہ بن گیا۔

1977ء کے بعد ملک ایک مرتبہ پھر مارشل لاء کے دور میں داخل ہوا اور 1979ء کے بعد مقامی حکومتوں کے مختلف نظام متعارف ہوئے۔ مقامی حکومت کا بنیادی تصور یہ تھا کہ عوام کے روزمرہ مسائل کے حل کے لیے اختیارات کو صوبائی دارالحکومتوں سے مزید نچلی سطح تک منتقل کیا جائے، لیکن یہ تجربات مستقل آئینی اور سیاسی تسلسل حاصل نہ کر سکے۔ مختلف ادوار میں مقامی حکومتوں کی تشکیل اور تحلیل ہوتی رہی، جس کے نتیجے میں اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی' ایک مستقل اور مستحکم ریاستی روایت نہ بن سکی۔

1985ء میں غیر جماعتی انتخابات ہوئے اور اس کے بعد سیاسی نظام دوبارہ پارلیمانی صورت میں آگے بڑھا، لیکن مقامی اور قومی سیاست میں برادری، علاقائی وابستگی، شخصی اثر و رسوخ اور انتخابی حلقوں کی سیاست کا کردار بھی نمایاں رہا۔ اس صورتِ حال کو صرف کسی ایک آئینی تبدیلی کا نتیجہ قرار دینا درست نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کے پسِ منظر میں نوآبادیاتی انتظامی روایت، کمزور سیاسی جماعتیں، محدود بلدیاتی ادارے، معاشی ناہمواری اور مقامی طاقت کے مختلف مراکز سمیت متعدد عوامل کارفرما تھے۔

1990ء کی دہائی میں جمہوری حکومتوں کے درمیان سیاسی کشمکش جاری رہی اور وفاقی و صوبائی تعلقات بھی مختلف سیاسی تنازعات کا شکار رہے۔ اس دوران یہ احساس مضبوط ہوتا گیا کہ پاکستان میں ریاستی اداروں اور عوام کے درمیان فاصلے کو کم کرنے کے لیے صرف قومی اور صوبائی سطح کی حکومتیں کافی نہیں، بلکہ ایک مؤثر اور بااختیار مقامی حکومتیں بھی ضروری ہیں۔

1999ء کے بعد جنرل پرویز مشرف کے دور میں 2001ء کا ضلعی حکومت کا نظام

متعارف ہوا، جس میں ضلع ناظم، ضلع کونسل اور مختلف مقامی اداروں کے ذریعے انتظامی اختیارات کو نچلی سطح تک منتقل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس نظام میں ڈپٹی کمشنر کے روایتی انتظامی کردار کے بجائے منتخب ضلعی حکومت کو مرکزی حیثیت دینے کی کوشش کی گئی، تاہم اس نظام کے سیاسی اور انتظامی تجربے نے بھی یہ سوال برقرار رکھا کہ اختیارات کی حقیقی منتقلی کس حد تک ہوئی اور مقامی حکومتیں صوبائی اور مرکزی سیاسی نظام کے ساتھ کس طرح مستقل طور پر مربوط ہو سکتی ہیں۔ اسی دور میں قانونی فریم ورک آرڈر 2002ء کے ذریعے آئین میں آرٹیکل 140A شامل کیا گیا، جس میں ہر صوبے کے لیے مقامی حکومت کا نظام قائم کرنے اور سیاسی انتظامی اور مالی ذمہ داری اور اختیار منتخب مقامی نمائندوں کو منتقل کرنے کی اصولی ذمہ داری عائد کی گئی۔ بعد میں اٹھارہویں آئینی ترمیم کے ذریعے آرٹیکل 140A کی موجودہ آئینی صورت سامنے آئی، جس کے تحت مقامی حکومتوں کے قیام اور اختیارات کی منتقلی کو آئینی تقاضا بنایا گیا ہے۔

یہاں ایک اہم بات یہ ہے کہ پاکستان میں مقامی حکومت کا مسئلہ محض انتظامی مسئلہ نہیں، بلکہ ریاستی تشکیل کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اگر صوبائی حکومتیں تمام سیاسی انتظامی اور مالی اختیارات اپنے پاس مرکوز رکھیں اور مقامی حکومتیں صرف محدود انتظامی اداروں کے طور پر کام کریں تو عوام کو بااختیار بنانے کا آئینی تصور مکمل نہیں ہو سکتا۔ آرٹیکل 140A اسی لیے محض بلدیاتی انتخابات کا تقاضا نہیں کرتا، بلکہ سیاسی انتظامی اور مالی ذمہ داری اور اختیار کی منتقلی کا اصول بھی بیان کرتا ہے۔ 2010ء کی اٹھارہویں آئینی ترمیم پاکستان کی وفاقی تاریخ میں ایک اہم مرحلہ تھی۔ اس ترمیم نے صوبائی خود اختیاری کو مضبوط کیا اور وفاق و صوبائی اختیارات کی تقسیم میں اہم تبدیلیاں کیں۔ اسی وسیع تر آئینی عمل میں مقامی حکومت کے آئینی تصور کو بھی موجودہ شکل میں برقرار رکھا گیا۔ اس طرح ریاستی اختیارات کی تقسیم وفاق سے صوبے اور صوبے سے مقامی حکومت تک ایک مسلسل بحث بن گئی۔

اس تاریخی پسِ منظر میں نئے صوبوں کا مطالبہ ایک فطری انتظامی اور سیاسی سوال کے طور پر سامنے آتا ہے۔ بڑے صوبوں میں آبادی کے حجم، انتظامی فاصلے، وسائل کی تقسیم، علاقائی محرومی اور نمائندگی کے مسائل' نئے انتظامی یونٹس کے مطالبات کو تقویت دیتے رہے ہیں۔ جنوبی پنجاب کا مطالبہ بھی اسی وسیع تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے، جہاں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا موجودہ صوبائی انتظامی ڈھانچہ پورے خطے کی ضروریات کو مؤثر انداز میں پورا کر سکتا ہے یا نہیں؟

تاہم نئے صوبے کے قیام کے سوال کو صرف انتظامی سہولت کے زاویے سے دیکھنا بھی کافی نہیں، کیوں کہ نیا صوبہ قائم ہونے کے بعد اگر اسی مرکزیت پسند انتظامی ثقافت کو برقرار رکھا جائے، جس میں اختیارات' دارالحکومت اور چند بڑے شہروں میں مرکوز رہیں تو انتظامی نقشہ بدلنے کے باوجود عام شہری کی زندگی میں بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی۔ اس لیے نئے صوبے کے مطالبے کے ساتھ یہ سوال بھی لازم ہے کہ نئے صوبے کے اندر اختیارات کس طرح تقسیم ہوں گے؟ مقامی حکومتیں کتنی بااختیار ہوں گی؟ وسائل کی تقسیم کا معیار کیا ہوگا؟ اور عام شہری' ریاستی فیصلوں میں کس حد تک شریک ہوگا؟

پاکستان کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ انتظامی وحدت اور قومی وحدت ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ 1955ء کا 'وَن یونٹ' انتظامی وحدت پیدا کرنے کی کوشش تھا، لیکن اس نے علاقائی شناخت کے سوال کو ختم نہیں کیا۔ 1970ء میں صوبائی اکائیوں کی بحالی نے انتظامی شناختیں دوبارہ قائم کر دیں، لیکن 1971 کا بحران ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ قومی ریاست کی مضبوطی صرف انتظامی تقسیم سے نہیں، بلکہ سیاسی انصاف، عوامی نمائندگی، آئینی توازن اور باہمی اعتماد سے پیدا ہوتی ہے۔

پاکستان کے تمام ریاستی مسائل جہاں بنیادی طور پر نوآبادیاتی وِرثے کا نتیجہ ہیں، وہاں برطانوی دور کی انتظامی روایت نے ریاستی ڈھانچے پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اسی کے ساتھ قیامِ پاکستان کے بعد کے سیاسی فیصلے، فوجی مداخلتیں، کمزور جمہوری ادارے، جماعتی نظام کی کمزوریاں، قرضوں کی معیشت، وفاقی اور صوبائی کشمکش اور مقامی حکومتوں کے عدمِ تسلسل نے بھی موجودہ ریاستی زوال پذیری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ریاستی تشکیلِ نو کا اصل سوال اس مقام پر سامنے آتا ہے کہ ریاست' شہری کے لیے کتنی قابلِ رسائی ہے؟ ایک عام شہری کو تعلیم، صحت، انصاف، روزگار، بلدیاتی سہولیات، پولیس اور انتظامیہ تک رسائی کے لیے کتنی دور جانا پڑتا ہے؟ اور اس کے فیصلوں میں اس کی آواز کتنی مؤثر ہے؟ اگر ایک نیا صوبہ قائم ہو جائے، لیکن شہری کو بنیادی سہولتوں کے لیے وہی طویل انتظامی سفر طے کرنا پڑے تو صرف صوبے کی نئی قائم کی گئی حدود' شہری کی حقیقی مشکلات ختم نہیں کر سکتیں۔

قومی خود شناسی بھی اسی ریاستی تشکیلِ نو کا ایک اہم پہلو ہے۔ شہری کا اپنی دھرتی، زبان، ثقافت، تاریخ اور معاشرتی شناخت سے تعلق' ریاست مخالف جذبے کا نام نہیں، بلکہ مضبوط قومی ریاست کی تعمیر کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ جب ریاست مختلف علاقائی شناختوں کو قومی وحدت کے اندر احترام کے ساتھ جگہ دیتی ہے تو علاقائی وابستگی قومی وابستگی کے لیے خطرہ نہیں رہتی، بلکہ قومی شناخت کو مزید مضبوط کر سکتی ہے۔ پاکستان کے لیے اس وقت اصل ضرورت ایسی حکمرانی کی ہے، جس میں وفاق اپنی آئینی ذمہ داریاں ادا کرے۔ صوبے اپنے دائرۂ اختیار میں مؤثر ہوں اور مقامی حکومتیں محض نمائشی ادارے نہ رہیں، بلکہ سیاسی انتظامی اور مالی اختیارات کے ساتھ حقیقی عوامی حکومت کی حیثیت سے کام کریں۔ آئین کا آرٹیکل 140A اسی اصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اختیارات' عوام کے منتخب نمائندوں تک حقیقی طور پر منتقل کیے جائیں۔

اس تناظر میں نئے صوبوں کے قیام کی بحث کو مسترد کرنا بھی درست نہیں اور اسے تمام مسائل کا واحد حل سمجھنا بھی درست نہیں۔ نئے صوبے بعض علاقوں میں انتظامی فاصلے کم کر سکتے ہیں، بہتر نمائندگی پیدا کر سکتے ہیں اور وسائل کی تقسیم کو زیادہ مؤثر بنا سکتے ہیں، لیکن ان کے فوائد اسی وقت پائیدار ہو سکتے ہیں جب ان کے ساتھ مضبوط مقامی حکومت، مؤثر عدالتی نظام، شفاف مالیاتی نظم، میرٹ پر مبنی انتظامیہ اور عوامی شرکت کا نظام بھی موجود ہو۔

بقیہ: صفحہ 12 پر

معاشی وسائل پر مبنی رزق کے حصول سے متعلق ابواب

مترجم: مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه'' میں علم السلوک والاحسان سے متعلق امورِ کلیہ اور طریقت میں نفس، قلب اور عقل کے حالات اور مقامات بیان کرنے کے بعد معاشی وسائل حاصل کرنے اور اُن کے استعمال سے متعلق ابواب کا عنوان ''مِن أبواب ابتغاء الرّزق'' قائم کیا ہے۔ ان ابواب کے تحت معاشیات سے متعلق اُمورِ کلیہ اور وہ بنیادی اَساسی اُصول جن سے خرید وفروخت یا دیگر مالی معاملات سے متعلق درج ذیل پانچ بنیادی اُمور بیان کیے ہیں:

1۔ انسانوں کا اپنی معاشی حاجات کو پورا کرنے کے لیے قدرتی وسائل میں محنت اور دیگر لوگوں کے اموال باہمی رضامندی یا تبادلۂ دولت سے حاصل کرنا۔
2۔ معاشی معاملات میں ملکیت، باہمی تعاون، اہمیت اور ضرورت کا بیان۔
3۔ معاشی وسائل کے لیے کسی نہ کسی پیشے کو بہ طورِ سبب کے اختیار کرنے کی اہمیت۔
4۔ تبادلۂ دولت؛ چار بنیادی اَساسی اُصولوں کو اختیار کرنے کی ناگزیریت۔
5۔ ملکوں اور اُن کی معاشی مصلحتوں میں فساد مچانے والے اُمور کی نشان دہی۔

اس باب میں رزق کے حصول سے متعلق احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں وراثت سمیت معاشی وسائل سے متعلق اہم اُمور بیان کیے گئے ہیں۔ مترجم)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه'' میں فرماتے ہیں:

(محنت کی عظمت واہمیت)

''یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور زمین میں ان کی معاشی حیات (Economic Life) کے لیے سب کچھ سامان فراہم کر دیا اور ان سب کو سب کے لیے مباح (Permissible) اور عام (Common) کر دیا تو مخلوقات کے درمیان مزاحمت اور مناقشت (Resistance & Conflict) شروع ہو گئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ: (أ) جب خود کوئی شخص (محنت ومشقت کے ذریعے) سبقت اور پہل کر کے کسی (قدرتی) شئے کو اپنے قبضے میں کر لے، (ب) یا اُس کے مورث (نے محنت کی اور اس) کی سبقت کی وجہ سے اس کے قبضے میں آجائے، (ج) یا ان کے علاوہ ایسے دوسرے طریقوں سے اس کا قبضہ ہو جائے - جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز طریقے قرار پا چکے ہیں -تو ایسی صورت میں اب کسی دوسرے شخص کو اس کی (حاصل کردہ) مقبوضہ (Owned / Possessed) شئے میں مزاحمت کا حق نہیں ہے۔

البتہ دوسرے کی مقبوضہ شئے کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ یہ ہے کہ:

☆ خرید وفروخت اور لین دین کے ذریعے تبادلے (Exchange) کی شکل پیدا ہو،
☆ یا معتبر طریقوں سے باہمی رضامندی کا معاملہ اس طرح انجام پا جائے کہ ہر دو جانب میں اس کے متعلق صحیح علم ہو اور اس معاملے میں نہ اِلتباس (دونوں طرف سے کوئی اُلجھاؤ) اور دھوکے کا دخل ہو اور نہ خلط ملط کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

(اجتماعی اور معاشی زندگی میں تعاونِ باہمی کی اہمیت)

نیز جب کہ انسان مدنی الطبع (فطری طور پر اجتماعیت پسند) واقع ہوئے ہیں تو ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون واشتراک کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا: (أ) اللہ تعالیٰ نے تعاون اور باہمی اشتراکِ عمل کو واجب کر دیا (ب) اور یہ بھی لازم قرار دیا کہ کسی فرد کو بھی ایسے امور سے کنارہ کش ہونے کا حق حاصل نہیں ہے، جو تمدن میں دخیل (شامل) ہیں، مگر یہ کہ کسی شخص کو بعض مجبور کن حالات ایسا کرنے پر مجبور کر دیں۔

(معیشت کے حصول کے بنیادی اسباب؛ زراعت، تجارت اور صنعت)

نیز اسبابِ معیشت کے ''اسباب'' بننے میں اصل الاصول یہ ہے کہ: (أ) اموالِ مباح (قدرتی وسائل) (Goods Permissible & Properties) میں سے کسی شئے کو اپنے قبضے میں لیا جائے، (ب) یا ان اموالِ مباح کے وسیلے سے جو کہ (محنت کر کے) مالی ترقی کا ذریعہ بنا کرتے ہیں، اپنے مقبوضہ اور مشخّصہ مال (Private Property) کو ترقی دی جائے۔ مثلاً؛ چرائی (کی محنت) کے ذریعے سے چوپایوں کی افزائشِ نسل (Breeding of Race) کرنا، یا زمین کی درستی اور پانی کی سیرابی کے ذریعے سے زراعت وکاشت کاری کرنا، لیکن مالِ مباح (قدرتی اشیا) کو اپنے لیے خاص کرنے یا دوسرے اموالِ مباح کو اپنے مال کی ترقی کا ذریعہ بنانے میں شرطِ اوّلین یہ ہے کہ یہ تصرفات اس طرح عمل میں نہ آنے پائیں کہ ایک فرد دوسرے فرد کے لیے معاشی ذرائع کی تنگی اور ضیق کا باعث بن جائے اور اس طرح تمدن کو فاسد اور برباد کر دے۔

پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ اگر ''معاشی معاملات'' میں لوگوں کے درمیان باہمی تعاون واشتراکِ عمل کے ذریعے مالی ترقی ونمو بروئے کار نہ آئے تو تمدن کا صالح اور صحیح رہنا دشوار سے دشوار تر ہو جائے گا، یعنی: لوگوں کے مالوں میں معاشی تعاونِ باہمی کے ذریعے اقتصادی ترقی کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کسی ملک اور قوم کی حالت انتہائی مشکل اور ناممکن ہوتی ہے۔ (معاشی ترقی کے درج ذیل طریقے ہیں:)

(1) مثلاً: ایک چاہتا ہے کہ وہ تجارتی مال کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جائے اور ایک معین مدت کے لیے وہ اس ایاب و ذہاب (آنے اور جانے) کی گارنٹی چاہتا ہے (یعنی تجارت کو ذریعۂ معاش بناتا ہے)۔ (جدید معاشی اصطلاح کے مطابق: ''افادۂ مقام کی محنت'' / Utility of Place)۔

(2) یا مثلاً: ایک دوسرا شخص اپنی عملی جدوجہد کے ذریعے دوسروں کے مال کی دلالی کرتا ہے (یعنی محنت کو ذریعۂ معاش بناتا ہے)۔ (معاشی اصطلاح کے مطابق: ''حفاظتِ اشیا کی محنت'' / Utility of Security)۔

(3) یا ایک تیسرا شخص اپنی نئی نئی پسندیدہ ایجادات کے ذریعے دوسروں کے مال کو بیش قیمت اور بہتر بناتا ہے (یعنی صنعت وحرفت کو وسیلۂ معاش بناتا ہے)۔ (معاشی اصطلاح کے مطابق: ''افادۂ شکل'' / Utility of Form)۔ بقیہ صفحہ 10 پر

رپورٹ: سیّد نفیس مبارک ہمدانی، لاہور

رسالتِ محمدی ﷺ
کی عالمگیریت اور انسانیت کی کامیابی

28/ اگست 2026ء کو حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہ نے جامع مسجد قبا مانسہرہ میں خطبہ جمعہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''رسول اللہ ﷺ انسانوں میں ایسی عظیم شخصیت ہیں کہ وہ کسی ایک قوم یا نسل یا کسی ایک دائرے میں محدود نہیں ہیں۔ آپ ﷺ کی بعثت تمام انسانوں اور تمام اقوام کی طرف ہوئی۔ ہر انسان جو نبی اکرم ﷺ کے بعد اس دنیا میں پیدا ہوا ہے، 1400 سال پہلے کا انسان ہو یا قیامت تک جو بھی انسان اس دنیا میں آئے گا، نبی اکرم ﷺ ان تمام کے لیے نبی ہیں۔ آپ ﷺ کی بات ماننا، آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرنا اور آپ ﷺ کی بتائی ہوئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہر انسان کے لیے لازمی ہے۔ آپ ﷺ کو نہ ماننے کے نتیجے میں انسانیت اس دنیا اور آخرت میں عذاب کی مستحق بنتی ہے، اور آپ ﷺ کی بات کو ماننے کے نتیجے میں دنیا کی عزت اور کامیابی بھی ملتی ہے اور آخرت کی کامیابی اور ترقی بھی ملتی ہے۔ سیرتِ مبارکہ پر گفتگو محض دل پرچانے، مقررین کا جوش نکالنے اور سامعین کی واہ واہ کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ آپ ﷺ کی سیرت پر گفتگو کے لیے انتہائی ادب اور عظمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی محفل میں آپ ﷺ کی گفتگو کو پوری عزت و وقار اور عظمت کے ساتھ سننے، دل و دماغ کو آپ کے فرمودات کی طرف متوجہ کرنے اور عقل و شعور کے ساتھ پوری سمجھ داری اور فہم کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسمی طور پر سن لینا اور لاپرواہی سے چھوڑ دینا آپ ﷺ کی سیرت کے حوالے سے نہیں کیا جاسکتا۔

نبی اکرم ﷺ کل انسانیت کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے۔ رسول کا لفظی ترجمہ پیغام لانے والا پیغمبر ہے، لیکن آپ ﷺ کو محض 'ڈاک لانے والا' سمجھنا آپؐ کی توہین ہے۔ آپ ﷺ ایسے پیغمبر ہیں جیسے ایک بادشاہ کسی کو کسی صوبے یا اپنے ملک کے کسی حصے کا افسرِ اعلیٰ مقرر کرتا ہے اور اس کو اختیار دیتا ہے کہ لوگ اس کی بات کو ہر حال میں مانیں۔ اس کی خلاف ورزی بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی ہے اور اس کی بات ماننا بادشاہ کو خوش کرنا ہے۔ اس کائنات کا شہنشاہِ عالم اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، جو مالک الملک اور مطلق حکمران ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ انبیا علیہم السلام کو اپنے اپنے زمانے اور اپنے اپنے علاقے کے لیے اللہ کے احکامات کو عمل میں لانے کے لیے اختیارات دے کر بھیجتا ہے۔ انبیا علیہم السلام اللہ کے وہ خلیفہ اور نائب ہوتے ہیں جو اپنے اپنے زمانے اور اپنے اپنے علاقے کے لیے احکاماتِ الٰہیہ نافذ کرتے ہیں۔ ان کا زمانہ اور علاقہ مخصوص ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ''مجھ سے پہلے تمام انبیا علیہم السلام اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے، لیکن میری بعثت پورے کرۂ ارض کی تمام اقوام اور تمام زمانوں کے لیے ہے''۔ (رواہ البخاری) آج کے بعد سے کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں آپ کی نبوت اور آپ ﷺ کی رسالت یعنی اتھارٹی قائم نہ ہو''۔

رسالتِ نبوی ﷺ: قوتِ نافذہ اور نظامِ حکومت

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

''انبیا علیہم السلام دنیا میں اللہ کی طرف سے اتھارٹی بن کر آتے۔ وہ صرف پیغامِ الٰہی ہی نہیں لاتے، بلکہ قوتِ نافذہ بھی لے کر آتے ہیں۔ صرف وعظ نہیں کہتے، بلکہ قوت، طاقت اور حکومت وخلافت سے اس سسٹم کو غالب کرتے ہیں جو سچائی اور حقانیت پر قائم ہو۔ آج کا سب سے بڑا فتنہ یہ پروپیگنڈا بھی ہے کہ 'نبی بس وعظ و نصیحت کے لیے آتا ہے، کوئی مانے یا نہ مانے'، یہ تصور بالکل غلط ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن حکیم کا پیغام انسانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے برحق نازل کیا۔ قرآن آئین، دستور اور وہ بنیادی اقدار بیان کرتا ہے جن پر انسانی معاشرے کی تشکیل ہونی ہے۔ عبادات، معاملات، لین دین، سیاست، معیشت اور سماج بنانے کی بنیادی اقدار، ویلیوز اور آئینی فریم ورک قرآن بیان کرتا ہے۔ پھر رسول کو قوتِ نافذہ اور حکمرانی کی طاقت دے کر بھیجا جاتا ہے۔ رسول کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو اس آئینی فریم ورک کے مطابق معاشرے میں کردار ادا کرے، اس کو انعام دے، اس کی حوصلہ افزائی کرے اور خوش خبری سنائے، اور جو اس نظام کی خلاف ورزی کرے، اس کو سزائیں اور خوف ورعب سے ڈرائے۔ ''بشیر'' (انعام کی خوش خبری دینے والا) اور ''نذیر'' (سزا سے ڈرانے والا) ہونا' حکومت کے لوازمات میں سے دو ضروری چیزیں ہیں۔

کسی عالم کے وعظ اور کسی افسر کی اتھارٹی میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ واعظ کا وعظ سن کر انسان عمل کرے یا نہ کرے، لیکن حکمران کے پاس عمل درآمد کرانے کی اتھارٹی ہوتی ہے۔ حکومت وہ ہوتی ہے جو اپنی بات اور انسانی فائدے کی بات لوگوں پر نافذ کرے۔ نبی امت اور انسانیت پر بلاتفریق رحم کھاتے ہوئے قرآن کے آئینی ضابطے کے تحت احکامات کی پاسداری کا نفاذ کرتے ہیں اس کام کے لیے نبی اور رسول اتھارٹی رکھتے ہیں اور اتھارٹی کا بنیادی تقاضا حکومت اور بادشاہت ہے۔

انگریزوں کی غلامی کے زمانے سے ہمیں یہ تعارف کرادیا گیا کہ نبی کا کام احکامات بتلادینا ہے، عمل کرو یا نہ کرو، حکومت کا اس سے کوئی لین دین نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج نماز اور عبادات کے ساتھ سرمایہ داری، لوٹ کھسوٹ، مافیاز اور سود کا نظام بھی قائم ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم نے رسول کو اتھارٹی نہیں مانا۔ رسول اللہ ﷺ صرف واعظ یا معلم ہی نہیں تھے، بلکہ تعلیم دینے کے ساتھ عمل درآمد کرانے کی اتھارٹی بھی رکھتے تھے۔ آپؐ انسانیت کے ایسے معلم تھے کہ تعلیم کی خلاف ورزی کرنے والے کو پہلے پیار سے سمجھاتے، پھر ریاست کے نظم ونسق اور ڈسپلن کو قبول کرنے کی ذمہ داری عائد کرتے۔ عقیدہ منوانے میں جبر نہیں، لیکن ظلم، زیادتی، فتنہ وفساد اور ریاستی قوانین کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں۔ ریاست میں رہنے کے لیے جان، مال، عزت اور آبرو کے تحفظ کے قوانین کی پاسداری ضروری ہے۔ یہی نبی کی ریاست اور حکومت کا بنیادی کردار ہے''۔

دینِ اسلام کا نظامِ عبادات، اجتماعیت اور نظم وضبط

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

’’مکہ کی مقتدر قوتوں نے مکہ اور پورے جزیرۃ العرب میں جہالت، ظلم، ناانصافی اور جبر پیدا کیا ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ نے ریاستِ مدینہ بنانے کے لیے اس کو اپنی اتھارٹی اور طاقت کے بل بوتے پر غزوۂ بدر سے لے کر فتح مکہ تک ان غزوات کے ذریعے سے مکہ کے کفر اور ظلم کی طاقت توڑی ہے۔ سیاسی نظام ختم کیا، معاشی نظام ختم کیا۔ ایسے سماجی لین دین اور معاہدات — جو ظلم اور ناانصافی پر مبنی تھے — توڑے اور ریاستِ مدینہ میں سیاست کا نیا ڈھانچہ کھڑا کیا، جو امن وامان، جان، مال، عزت اور آبرو کے تحفظ کی بنیاد پر تھا۔ معیشت کا نیا نظام قائم کیا جو لوٹ کھسوٹ، استحصال، سود، جوئے اور بدمعاشی کے ہر دائرے سے پاک نیا ماڈل بنایا۔ کیا یہ اتھارٹی کے بغیر بنتا ہے؟

مکہ میں ورقہ بن نوفل جیسے لوگ تنہائی میں اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کبھی جاہلیت کے زمانے میں کسی بت کو سجدہ نہیں کیا، صرف اللہ کو مانا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن بھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا، میں صرف اللہ کی عبادت کرتا تھا۔ یہ عبادات انفرادی طور پر تو پہلے بھی موجود تھیں۔ آپؐ نے عبادات کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظامِ عبادات، نظامِ نماز، نظامِ حج، نظامِ صوم، نظامِ زکوٰۃ وغیرہ عبادات سرانجام دینے کے طور طریقے متعین کیے، سسٹم بنائے۔

اس کی مثال نماز کی عبادت ہے کہ نماز میں جب آپ نے کسی فرد کو اپنا امام بنالیا تو پوری نماز کے دوران آپ اپنے اختیارات ختم کر کے امام کے پیچھے امام کے رکوع، سجدہ اور قیام میں اس کی پیروی کرنی ہے۔ امام جیسے ہی رکوع میں گیا، سب کو ایک ڈسپلن کے تحت رکوع میں جانا ہے۔ امام جیسے ہی سجدے میں گیا، سب کو سجدے میں جانا ہے۔ کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ امام کی آواز پر لبیک نہ کہے۔ اجتماعیت ایک نظم وضبط چاہتی ہے۔ اس کے لیے ایک حکم دینے والا ضروری ہے۔ امام جب بنالیا تو اس کی اقتدا کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح یہ اجتماعیت کا درس حج میں بھی دیا کہ پورے حج کا ایک ’’امیر الحج‘‘ ہو جو حج کے تمام مناسک اور طور طریقے پورے کرائے۔ امیر الحج انسانوں کی جان، مال، عزت اور آبرو کے تحفظ کے لیے حج کے جو قوانین جاری کرے، وہ تمام لوگوں کو ماننے ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت ہو تو تمام ظاہری اموال کی زکوٰۃ وصول کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ زکوٰۃ کا مال یتیموں، مسکینوں اور ضرورت مندوں تک پہنچائے۔ گویا دین اسلام ہر چیز کا ایک نظام پیش کرتا ہے، سسٹم بناتا ہے۔

قرآن نے واضح کیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اتھارٹی، حکومت کا پروانہ اور اپنا خلیفہ بنا کر پوری دنیا اور انسانیت کا خلیفۃ اللہ فی الارض اور اپنا نائب بنا کر بھیجا، تا کہ انسانیت کو درست راستے پر چلنے کی ہدایت اور رہنمائی دے، عقل وشعور، فہم وبصیرت کے ساتھ صحیح اور غلط میں تمیز سکھائے۔ وہ قرآن سکھائے، جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے‘‘۔

دین ودنیا کی جامعیت اور رسالتِ نبوی ﷺ کی سیاسی اتھارٹی

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

’’دینِ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے، لیکن آج ہم نے تفریق قبول کر لی ہے، نماز اللہ کی پڑھتے ہیں اور بازار امریکا کا چلاتے ہیں، سرمایہ داری کا چلاتے ہیں، سودخوری کا چلاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عبادات کے ساتھ ساتھ حکومت مضبوط کی۔ آپ ﷺ کے بعد جس قبیلے کے فرد نے بھی ریاستی رٹ کو چیلنج کیا، خواہ وہ کلمہ پڑھتا تھا، نمازیں پڑھتا تھا، عبادت کرتا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے اس سے جنگ کی اور ریاستی سسٹم کو طاقت ور بنایا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ رحم دل آدمی تھے، لیکن جب حکومتی رٹ کا معاملہ آیا تو سب سے زیادہ سیاست اور حکومتی رٹ کو نافذ کرنے میں کردار ادا کیا، کیوں کہ اس کے بغیر ریاست قائم نہیں رہ سکتی، ورنہ حکومت کو مذاق بنالیا جاتا۔

پھر حضرت عمر فاروقؓ نے اسی مضبوط حکومت کی فوجیں بھیج کر قیصر وکسریٰ کو طاقت کے بل بوتے پر شکست دی۔ اگر حضرت ابوبکرؓ کے دو سال نہ ہوتے تو حضرت عمر فاروقؓ کے پاس وہ طاقت ہی نہ ہوتی کہ قیصر وکسریٰ کو شکست دے پاتے۔ ان کے سسٹم توڑ سکتے۔ پھر اسی طاقت کی بنیاد پر حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں ایران، عراق، شام اور روم میں جہاں جہاں فتوحات ہوئیں۔ حضرت عمرؓ نے پرانا سسٹم توڑا تو حضرت عثمانؓ نے اسلام کا نیا سسٹم بنایا۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کے زمانے میں ظاہر سسٹم کے ساتھ ساتھ باطنی تربیت کا نظام بھی قائم ہوا۔ اسی سے صوفیا کے تمام سلاسل کی بنیاد پڑی۔

حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں دونوں جماعتوں کی متحد حکومت اور خلافت قائم ہوگئی اور انھوں نے دنیا کا بین الاقوامی نظام 20 سال تک عدل، انصاف، امن اور اسلام کے مطابق چلایا۔ بنواُمیہ کے بعد بحری بیڑے تیار کر کے قبرص، یورپ، افریقا، ہندوستان، کابل اور دور دراز علاقوں تک فتوحات ہوئیں۔ پوری دنیا میں دین کا سسٹم بنایا۔ اس طرح تسلسل کے ساتھ بنواُمیہ، بنوعباس اور بنوعثمان کے دور میں دینِ اسلام کا عبادات، سیاسیات اور معاشیات کا عادلانہ سسٹم قائم رہا۔

انگریز سامراج نے اپنے تسلط کے زمانے میں یہ غلط سوچ پھیلانے کی کوشش کی کہ کہ اسلام میں نہ حکومت ہے نہ سیاست، ہاں! اسلام میں ظالمانہ اور جابرانہ حکومت اور فراڈ کی سیاست نہیں ہے۔ جن علما اور بزرگوں نے سیاست کی نفی کی ہے، وہ ظلم کی سیاست کی نفی ہے، اسلام کی سیاست کی نفی نہیں۔ بانی تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے فرمایا کہ ہم پچھلے تین سو سال سے علیٰ سبیل السیاسۃ (سیاسی نقطۂ نظر سے) کام کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئے، سیاسی عقل نہیں رہی، اب سیاست پیدا کرنے کے لیے علیٰ سبیل الدّعایہ (دعوت کے اصول پر) کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سیرت نبوی کے تناظر میں آپ ﷺ کی حکمرانی، شریعت، طریقت اور سیاست کی جامعیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بادشاہِ عالم ہیں، ان کی نیابت میں حکومت اور سیاست قائم کرنا آج مسلمانوں کا فریضہ ہے‘‘۔

مفتی محمد اشرف عاطف، لاہور

عثمانی سلطنت کے دسویں حکمران؛ سلیمانِ اعظم

سلطان سلیم کے بعد ان کے بیٹے سلیمان' سلطانی کے منصب پر فائز ہوئے، جن کو عیسائی مؤرّخین بھی ''سلیمانِ اعظم'' اور ''سلیمانِ اکبر'' کے القاب سے پکارتے ہیں۔ تخت نشینی کے وقت ان کی عمر چھبیس سال تھی۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ: ان کی حکومت میں عدل وانصاف اور رحم وکرم کا دور دورہ تھا۔ قرآن حکیم کی دو آیات اس کا دستور العمل تھیں ایک: ''اللہ تعالیٰ عدل وانصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے'' اور دوسری آیت جس کا ترجمہ ہے: ''انصاف کے ساتھ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو''۔ سلیمان' سلطان بننے سے پہلے مختلف صوبوں کے حاکم رہ چکے تھے۔ جب سلطان سلیم نے ایران پر حملہ کیا تو سلیمان کو سلطنت کا نائب بنا کر گئے تھے۔

سلطان سلیم کے انتقال کے بعد جب وہ تخت نشین ہوئے تو ایک کامیاب اور مدبر حکمران کے طور پر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ذاتی اوصاف وعظمت کے لحاظ سے اپنے سابقہ حکمرانوں سے بڑھ کر تھے اور عثمانی سلطنت کو وسیع تر کرنے میں بھی نمایاں رہے۔ ان کی ذاتی زندگی بے داغ تھی۔ رحم وکرم اور عدل وانصاف ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے ہاں رنگ ونسل اور مذہب وملت کے امتیاز کے بغیر سب کے لیے انصاف یکساں تھا۔ رعایا کی فلاح و بہبود ان کا اولین ہدف تھا۔

وہ جب تخت نشین ہوئے تو رعایا نے ان کی شجاعت، رحم دلی اور دانش وحکمت جیسے اعلیٰ اخلاق کی بنا پر مسرت وشادمانی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال میں رعایا کے ساتھ رحم وکرم کی وہ مثالیں پیش کیں، جس سے ان کے مستقبل کے اقدامات کے بارے میں خوش آئند توقعات قائم کی جانے لگیں۔ مثلاً سلطان سلیم نے بالجبر چھ سو مصری باشندوں کو مصر سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا تھا۔ سلیمان نے ان سب کو اپنے وطن جانے کی اجازت دی۔ اسی طرح سلطان سلیم نے ایران سے تجارت کرنے کے باعث بعض تاجروں کا سامانِ تجارت ضبط کرلیا تھا تو سلیمان نے نقد روپیہ دے کر ان تاجروں کے نقصان کی تلافی کی۔ مزید یہ کہ حکومت کے اعلیٰ حکام۔ جو کسی بددیانتی اور کرپشن میں ملوث پائے گئے۔ ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔ ان تمام اقدامات سے رعایا نہایت مطمئن اور سلطان کے بارے میں خوش گمان ہوئی۔

سلطان سلیمان نے تمام صوبائی حکام کے پاس یہ حکم بھیجا کہ رعایا کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی وظلم نہیں ہونا چاہیے۔ امیر وغریب اور مسلم وغیر مسلم سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ ان احکام کے نفاذ سے ہر طرف امن وامان کا دور دورہ ہوا۔ ادھر مغربی یورپ کی حکومتیں قرون وسطی کے خلفشار سے نکل کر عہدِ جدید کے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے تیاری کر رہی تھیں۔ پچھلے چالیس سال سے سلطنتِ عثمانیہ اور ان یورپین حکومتوں کے درمیان کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ بایزید ثانی کے دورِ حکومت میں چھوٹی موٹی مسیحی حکومتوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں اور سلطان سلیم کی زیادہ تر توجہ اسلامی حکومتوں کی طرف مبذول رہی۔ اس درمیانے عرصے میں یورپین حکومتوں نے نمایاں ترقی کرلی تھی۔ یورپ کی ان حکومتوں؛ خصوصاً فرانس، انگلستان، آسٹریا اور اسپین میں اپنی قوت کا احساس اور مسلمانوں کے ساتھ مقابلے کا حوصلہ شدت سے پیدا ہوگیا تھا۔ یورپ مذہبی جوش سے بھرپور سلطنتِ عثمانیہ کے مقابلے کے لیے آمادہ ہو رہا تھا۔ شہنشاہ چارلس پنجم مسیحی اتحاد میں پیش پیش تھا۔

ان حالات میں مسیحی حکومتوں کے یہ عزائم، ادھر ایرانی حکومت دشمنی پر آمادہ اور مزید یہ کہ شام اور مصر میں ہر وقت بغاوت کا خطرہ ان بیرونی واندرونی خطرات کے ہوتے ہوئے سلطان سلیمان نے جس عقل و دانش اور حکمت عملی کو کام میں لاتے ہوئے ان خطرات کا مقابلہ کیا، جس سے عثمانی سلطنت کی قوت وسطوت میں اضافہ ہوا، بلکہ عیسائی سلطنتوں کے بہت سے صوبے عثمانی سلطنت کے مقبوضات میں شامل ہوئے۔ ان سب کامیابیوں کا سہرا اور اصلی سبب یہ تھا کہ سلطنت کی باگ ڈور ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں تھی، جو عثمانی سلطنت کا سب سے بڑا تاجدار اور اس وقت کا تمام دنیا کا سب سے بڑا حکمران تھا۔

سلیمان کے عہدِ حکومت میں سلطنت کا رقبہ 8 سے 10 لاکھ مربع میل سے زیادہ تھا، جو ہنگری سے لے کر بصرہ تک اور بحر کیسپین سے لے کر بحیرۂ روم کے مغربی حصے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایشیا، یورپ، اور افریقا کے بہت سے ممالک اس میں شامل تھے۔ سلطان سلیمان نے سلطنت کو اکیس صوبوں اور دو سو پچاس اضلاع میں تقسیم کر دیا تھا، تاکہ رعایا کو بہتر سے بہتر سہولتیں فراہم کی جاسکیں۔ سلطنتِ عثمانیہ میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے۔ بعض مؤرّخین کہتے ہیں کہ تقریباً بیس نسلیں آباد تھیں۔ ان میں عثمانی ترک، یونانی، رومی، آرمینی، البانوی، تاتاری، عرب اور دیگر بہت سی قومیتوں کے لوگ، جن کی آبادی تقریباً پانچ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ سلیمان کے عہدِ حکومت میں جو قوانین مرتب ہوئے اور اصلاحات ہوئیں، جن کے نتیجے میں معاشی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی ترقیات ہوئیں، ان کا ہم اگلی قسط میں ذکر کریں گے۔ ان شاءاللہ!

بقیہ: معاشی وسائل پر مبنی رزق کے حصول سے متعلق ابواب

(4) اور اس طرح دوسرے جائز طریقے اختیار کرتا ہے (تو ان سب صورتوں میں تعاون کے بغیر معاشی زندگی میں استواری پیدا نہیں ہوسکتی)۔

بہر حال ان تمام معاملات میں صحیح تعاون واشتراکِ عمل ضروری اور واجب ہے۔ اور اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس میں سِرے سے تعاون کا کوئی دخل ہی نہ ہو، جیسا کہ قمار (جُوّا، سٹہ) کا کاروبار یا ایسے طریقے سے عمل میں آئے کہ بہ ظاہر تو تعاون نظر آتا ہو، لیکن حقیقت میں وہ زبردستی کا تعاون ہو، حقیقی تعاون نہ ہو، جیسا کہ مثلاً رِبا (سود) کا کاروبار''۔ (أبواب ابتغاء الرزق)

عظمت کے مینار

وسیم اعجاز، کراچی

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ ۲؍رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ / 24؍مئی 1887ء کو گوجرانوالہ کے قصبے ''جلال'' میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی کا نام شیخ حبیب اللہؒ تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے ہی میں حاصل کی۔ ابھی 8 سال ہی کے تھے کہ آپؒ کے والد شیخ حبیب اللہؒ نے آپؒ کو امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے حضور پیش کیا اور فرمایا کہ: ''ہم نے یہ بچہ دینِ اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے''۔ یوں مولانا لاہوریؒ، حضرت سندھیؒ کے زیرِ تربیت آ گئے اور حریت و آزادی کے عظیم پیغام سے سرفراز ہوئے۔ 1895ء میں حضرت سندھیؒ انھیں لے کر حضرت مولانا غلام محمد دین پوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کروائی۔ اسی دوران آپؒ کے والد شیخ حبیب اللہؒ کا انتقال ہو گیا تو مولانا لاہوریؒ کی والدہ اپنے بچوں کے ہمراہ مولانا لاہوریؒ کے پاس منتقل ہو گئیں۔

حضرت سندھیؒ نے بچوں کی کفالت اور تربیت کے پیشِ نظر بیوہ سے نکاح کیا اور پوری توجہ ان کی تعلیم و تربیت پر دی۔ مولانا موصوفؒ دین پور میں کچھ عرصہ قیام کے بعد امروٹ شریف میں حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے 1901ء میں گوٹھ پیر جھنڈو میں مرکز دارالرشاد قائم فرمایا تو مولانا لاہوریؒ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ 1909ء میں مولانا لاہوریؒ دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ اس موقع پر مولانا لاہوریؒ نے حضرت سندھیؒ سے وعدہ کیا تھا کہ تادمِ واپسیں خدمتِ قرآن حکیم کرتے رہیں گے۔

مولانا لاہوریؒ نے تعلیم سے فراغت کے بعد دارالرشاد (گوٹھ پیر جھنڈو) میں استاذ کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیے۔ اسی دوران امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی چھوٹی بیٹی مریم بی بی کا نکاح حضرت لاہوریؒ سے کر دیا، لیکن وہ کچھ عرصے بعد ہی انتقال فرما گئیں۔ 1913ء میں جب دہلی میں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' قائم کیا گیا تو امامِ انقلابؒ نے مولانا لاہوریؒ کو دہلی میں اپنے پاس بلا لیا۔ مولانا لاہوریؒ، حضرت سندھیؒ کے ایما پر ہی مولانا انیس احمد کے ہمراہ علی گڑھ منتقل ہوئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا۔ 1915ء میں جب امامِ انقلاب کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے کابل جانے کا حکم دیا تو ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے صدر مدرس کی ذمہ داری مولانا لاہوری کے سپرد کی اور مولانا موصوفؒ نے اس ذمہ داری کو دو سال تک بحسن و خوبی نبھایا۔

''نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی'' کے قیام کے دوران حضرت سندھیؒ جو بھی تفسیری نکات بیان فرماتے تھے، مولانا لاہوریؒ انھیں ضبطِ تحریر میں لے آتے تھے اور بعد میں حضرت سندھیؒ سے اس کی تصحیح بھی کرواتے تھے۔ انھی تفسیری نکات کو سامنے رکھ کر بعد میں حضرت لاہوریؒ نے ''قرآن عزیز'' کے نام سے قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیری حواشی لکھے اور اسی اَساس پر ہر سال دورۂ تفسیر قرآن حکیم پڑھایا۔

1916ء میں ''تحریکِ ریشمی رومال'' کے سلسلے میں جب تحریک کا راز افشا ہو گیا اور ہندوستان میں حریت پسندوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں تو مولانا احمد علی لاہوریؒ کو بھی دہلی سے حراست میں لیا گیا۔ اس پاداش میں دہلی، لاہور، شملہ اور جالندھر میں اسیری کے ایام بسر کیے۔ آخرکار اس شرط پر رہا ہوئے کہ دہلی اور سندھ کا سفر نہیں کریں گے اور لاہور ہی میں قیام ہوگا۔ لاہور میں رہ کر آپؒ نے عمومی اور خصوصی مجالس میں درسِ قرآن دینا شروع کیے۔ 1919ء میں جمعیت علمائے ہند کا قیام ہوا تو اس میں شامل ہوئے اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر کے طور پر ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ بعد ازاں پنجاب کے صدر کے طور پر بھی نامزد ہوئے۔

1920ء میں حج بیت اللہ سے واپس آئے تو اس وقت ''تحریکِ خلافت'' زوروں پر تھی اس میں شامل ہو گئے اور پُرجوش حصہ لیا۔ 1920ء میں ہی ''تحریکِ ہجرت'' سے متأثر ہو کر کابل جانے کا پلان بنایا۔ اس سے قبل آپؒ کے دو بھائی حضرت سندھیؒ کے ہمراہ کابل میں موجود تھے۔ کابل میں حضرت سندھیؒ سے ملاقات کے وقت وہاں کے حالات پہلے سے مختلف ہو چکے تھے۔ ان نامساعد حالات کی بنا کر حضرت سندھیؒ نے انھیں لاہور واپس جانے کا حکم فرمایا اور آپؒ واپس تشریف لے آئے۔

1922ء میں مولانا لاہوریؒ نے لاہور میں ''انجمن خدام الدین'' قائم فرمائی اور درسِ قرآن حکیم کا آغاز کیا۔ آپؒ کے حلقۂ درس میں مدارس کے علاوہ کالجز اور یونیورسٹیز کے طلبا بھی شریک ہوتے تھے۔ درسِ قرآن کا یہ سلسلہ اخیر دم تک جاری رہا۔ 1925ء میں ان دروس پر مشتمل تفسیر القرآن کو تحریر میں لانے کا آغاز فرمایا، جو کہ بعد میں ''قرآنِ عزیز'' کے نام 1928ء میں سے شائع ہوا۔

1924ء میں لاہور ہی میں قرآنی علوم و معارف کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ''شیرانوالا گیٹ'' میں ایک ادارہ ''قاسم العلوم'' کے نام سے قائم کیا۔ بعد ازاں اسی پلیٹ فارم سے نشر و اشاعت کا بھی آغاز ہوا۔ 1928ء میں حج بیت اللہ کے سفر کے موقع پر ایک بار پھر حضرت سندھیؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور 12 دن تک ان کے ساتھ مکہ مکرمہ میں قیام کیا اور مستفید ہوئے۔ 1931ء میں ''تحریکِ احرار'' کے زیرِ اہتمام کشمیر کے معاملے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی گرفتار کیے گئے۔ 1940ء میں حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو سمجھانے کے لیے دروس کا آغاز بھی کیا۔

1947ء کے بعد بھی لاہور میں درس قرآنِ حکیم کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھا۔ قادیانیت کی تحریک کے خلاف بھی سینہ سپر رہے۔ مولانا لاہوریؒ کا انتقال ۱۷؍رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ / 23؍فروری 1962ء کو لاہور میں ہوا اور قبرستان میانی صاحب لاہور میں مدفون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مرقد کو اپنی خاص رحمتوں سے منور فرمائے۔ آمین!

Monthly RAHIMIA Lahore

CPL No. 59

بقیہ: نئے صوبے یا ریاست کی تشکیلِ نو

ریاستی تشکیلِ نو کا مطلب صرف صوبوں کی تعداد میں اضافہ نہیں، بلکہ ریاست کے انتظامی فلسفے پر نظرِ ثانی بھی ہے۔ اس میں یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ریاستی طاقت کہاں مرکوز ہوگی؟ فیصلہ سازی کس سطح پر ہوگی؟ وسائل کس بنیاد پر تقسیم ہوں گے؟ شہری کو حکومتی اداروں تک کتنی آسان رسائی حاصل ہوگی؟ اور ریاست اپنے مختلف علاقوں کو محض انتظامی اکائیوں کے طور پر دیکھے گی یا انھیں قومی ریاست کے برابر کے شریک سمجھے گی؟

پاکستان کی انتظامی تاریخ – 1947ء سے آج تک – مسلسل تبدیلیوں کی تاریخ ہے۔ ریاستوں کا الحاق ہوا، صوبے بنے، وَن یونٹ قائم ہوا، پھر ختم ہوا، صوبائی شناختیں بحال ہوئیں، مقامی حکومتوں کے مختلف تجربات ہوئے، ضلعی حکومت کا نظام آیا، آئینی اختیارات کی تقسیم بدلی اور اٹھارہویں ترمیم کے بعد صوبائی خود اختیاری کو ایک نئی صورت ملی۔ اس پورے سفر سے ایک بنیادی حقیقت سامنے آتی ہے کہ انتظامی ڈھانچہ تبدیل کرنا نسبتاً آسان ہے، لیکن ایسی سیاسی اور انتظامی ثقافت پیدا کرنا مشکل ہے، جس میں اختیار عوام تک پہنچے اور ریاست قومی کردار ادا کرتے ہوئے شہری کے لیے جواب دہ ہو۔

اس لیے نئے صوبوں کی بحث کو ایک وسیع تر قومی سوال میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ سوال صرف یہ نہیں ہونا چاہیے کہ نیا صوبہ کہاں بنے گا؟ بلکہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ اس نئے صوبے میں حکمرانی کس اصول پر ہوگی؟ عوامی نمائندگی کس سطح تک پہنچے گی؟ وسائل کی منصفانہ تقسیم کیسے ہوگی؟ اور مقامی شہری اپنے علاقے کے فیصلوں میں کس حد تک شریک ہوگا؟ اگر یہ سوالات حل نہیں کیے جاتے تو نئے صوبے بھی سابقہ انتظامی کمزوریوں کی نئی صورت بن سکتے ہیں۔ پاکستان کو محض نئے انتظامی نقشے کی نہیں، بلکہ ایسی قومی وملّی ریاستی تشکیلِ نو کی ضرورت ہے، جس میں وفاقیت کا مفہوم مضبوط ہو، صوبائی خود اختیاری آئینی حدود میں مؤثر ہو، مقامی حکومتیں بااختیار ہوں، عوامی شرکت حقیقی ہو، وسائل کی تقسیم منصفانہ ہو اور شہری کو ریاست سے اپنا تعلق محض حکومتی احکامات کے ذریعے نہیں، بلکہ حقوق، ذمہ داریوں اور قومی وابستگی کے ذریعے محسوس ہو۔

آخر کار اصل سوال یہ نہیں کہ پاکستان میں کتنے صوبے ہونے چاہئیں؟ بلکہ یہ ہے کہ ریاست اپنے شہریوں تک کس حد تک پہنچتی ہے؟ اور شہری ریاست کے فیصلوں میں کس حد تک شریک ہیں؟ نئے صوبے اس عمل کا ایک حصہ ہو سکتے ہیں، لیکن مکمل حل نہیں۔ پاکستان کی آئینی اور انتظامی تاریخ یہی سبق دیتی ہے کہ مضبوط ریاست صرف انتظامی تقسیم سے نہیں بنتی، بلکہ عادلانہ حکمرانی، مؤثر نمائندگی، اختیارات کی منصفانہ تقسیم اور عوامی اعتماد سے تشکیل پاتی ہے۔ اس لیے آج پاکستان کے سامنے بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں صرف نئے صوبے بنانے ہیں؟ یا سامراجی انتظامی وِرثے سے آگے بڑھ کر ایک ایسی عادلانہ عوامی بااختیار اور حقیقی قومی ریاست بھی تعمیر کرنی ہے، جس میں ریاستی اختیار کا مقصد؛ شہری پر حکمرانی نہیں، بلکہ شہری کی خدمت اور قومی وحدت کا استحکام ہو۔ (مدیر)

دینی مسائل

اس صفحے پر قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں!

از حضرت مفتی عبدالقدیر　شعبۂ دارالافتا ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

سوال ایک شخص نے آٹا پیسنے والی چکی کرائے پر دی اور کرائے کے ساتھ ماہانہ ایک من آٹا بھی طے پایا تو کیا یہ ایک من آٹا لینا جائز ہے؟　سائل: محمد انس، میلسی

جواب مالک اور کرایہ دار کے درمیان کرائے کا تعین باہمی رضا مندی سے ہونا ضروری ہے اور کرائے کا معلوم و متعین ہونا شرطِ صحت ہے، تاکہ کسی قسم کا جھگڑا یا ابہام باقی نہ رہے۔ اگر دونوں فریقوں نے باہمی رضامندی سے کرایہ دو حصوں میں مقرر کیا ہو، مثلاً ماہانہ نقد رقم اور ایک من آٹا، تو یہ معاملہ درست اور جائز ہے۔ تاہم شرط یہ ہے کہ طے شدہ اُجرت علاقے کے معمول کے کرائے سے زائد نہ ہو، ورنہ زائد مقدارِ ظلم تصور ہوگی۔ کیوں کہ یہ کرایہ دار کی مجبوری سے ناحق فائدہ اُٹھانے کے مترادف ہے، جو کہ ناجائز ہے۔

سوال ٹرین میں سفر کے دوران نماز پڑھتے ہوئے قیام کی حالت میں اگر ٹرین ہچکولے کھانے لگے تو کسی چیز کا سہارا لے کر قیام کو برقرار رکھنا جائز ہے؟

جواب فرض نماز میں قیام کرنا' ارکانِ نماز میں سے ہے۔ اس لیے ہر حال میں اس کا اہتمام کرنا ضروری ہے، سوائے کسی شرعی عذر یا بیماری وغیرہ کے۔ ہاں! اگر ٹرین ہچکولے کھا رہی ہو اور اس حالت میں قیام برقرار رکھنا مشکل ہو تو کسی چیز کا سہارا لے کر قیام برقرار رکھنا جائز ہے۔

"رحیمیہ مطبوعات لاہور" کی جانب سے نئی پیش کش

کتاب: "ایمان کی چھاؤں میں" (دوسرا ایڈیشن، مع اضافہ جات)

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن مدظلہ

آج سے چالیس سال قبل 1986ء میں حضرت مفتی صاحب نے صحیح بخاری شریف کے "کتاب الإیمان" کے اُردو ترجمے، تشریح اور توضیح پر مبنی کتاب "ایمان کی چھاؤں میں؛ صحیح بخاری کا خصوصی مطالعہ" کے عنوان سے مرتب کی تھی، جس میں بخاری شریف کی مستند شروحات، خاص طور پر ولی اللّٰہی سلسلے کے مشائخ کی تشریحات کو سامنے رکھ کر "کتاب الإیمان" کے ابواب اور احادیث کی جامع توضیح کی۔

یہ کتاب کئی مرتبہ ملتان سے طبع ہو چکی ہے۔ اب یہ کتاب جدید ترتیب اور توضیح کے ساتھ "رحیمیہ مطبوعات لاہور" کی جانب سے شائع کی جا رہی ہے۔ اس اشاعت کے شروع میں حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہ العالی نے "حرفِ اوّل" تحریر کیا ہے، نیز اس کتاب کی فہارس (آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہ، اصطلاحات، شخصیات مقامات وغیرہ) بھی مرتب کی گئیں۔

کل صفحات: 368 (مجلد) عام قیمت: 1000 رعایتی قیمت: 500

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے: راؤ عتیق الرحمٰن خاں 0332-7203090

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہ نامہ "رحیمیہ" رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے جاری کیا۔